ڈاکٹر سمیر البشیر
شعبہ اردو، وفاقی جامعہ اردو، کراچی

ناول"اور انسان مر گیا" کا تنقیدی جائزہ

A CRITICAL VIEW OF "AUR INSAN MAR GAYA"

Abstract

Ramanand's novel "Aur Insan Mar Gaya" is written on the theme of social changes because of the partition of the sub-continent. In this novel, he has given an account of in human acts during the partition and occurrence of riots and tragic incidents arising from this situation.

The Author has written the novel under four heading, namely, The first part "Surkh Fawaray", the second part "Raqs-e-Sharer", the third part "Mein Bach Gaya" and the fourth part "Aur Insaan Mar Gaya". One incident of this novel has also been published as a short story entitled "Bhaag in Barda Faroshon Se".

The Novel is full of occurrences. Although in the beginning ramanand succeeds to some extent in narrating the events of migration and the riots. However, some events have been narrated in such a way that reveals his biased mentality and the philosophy of humanity is completely ignored. This Novel appears to be a political propaganda rather than a literary creation.

قیام پاکستان کے اعلان کے ساتھ ہی ہر طرف ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے۔ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کو قتل کرنے، خواتین کو اغواء اور بے آبرو کرنے یا مالی نقصان پہنچانے میں ایک دوسرے پر بازی لے جانے کے لئے ڈٹ گئے اور اس کے ساتھ ہی پاکستان سے ہندوستان اور ہندوستان سے پاکستان ہجرت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

ان المناک حالات میں ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے انسان ہونے کا حق ادا کیا اور نفرت اور تعصب کے جذبات سے باز رہے اور انسان ہونے کا حق ادا کیا۔ ہمارے ناول نگاروں نے جب فسادات اور ہجرت کے کرب اپنے ناولوں میں بیان کیا تو ایسے ہندوؤں اور مسلمانوں کے دوستانہ رویے کو بھی اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔

راما نند ساگر نے بھی اپنے ناول "اور انسان مر گیا" میں انسان کی انسانیت مر جانے اور تقسیم

ہند کے نتیجے میں پیدا ہونے والے معاشرتی المیوں کو بیان کیا ہے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے ہندوستان اور پاکستان ہجرت کرنے والے مہاجرین کے ساتھ پیش آنے مختلف حادثات اور مسائل کو بیان کیا ہے۔ اس ناول میں کچھ ایسے کردار بھی ہیں جو انسان ہونے کے ناطے دوسرے انسانوں کی بلا تعصب مدد کر رہے ہیں۔ اسلم آزاد نے رامانند ساگر کے ناول ''اور انسان مر گیا'' پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ :''۱۹۴۷ء کے بعد فسادات کے موضوع پر ناول لکھے گئے ان ناولوں میں ایک نقطہ نظر رامانند ساگر کا تھا (اور انسان مر گیا) کہ دراصل یہ فسادات انسانیت کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ تھا اور انہوں نے یہ ثابت کر دیا کہ انسانیت مر چکی ہے۔ رامانند ساگر کا مطمع نظر خالص انسان دوستی ہے''۔۱

ناول کو انہوں نے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے، پہلا حصہ ''سرخ فوارے'' دوسرا حصہ ''رقصِ شرر'' تیسرا حصہ ''میں بچ گیا'' اور چوتھا حصہ ''اور انسان مر گیا'' کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔ ناول کے تیسرے حصے ''میں بچ گیا'' کے ایک واقعے کو بھاگ ان بردہ فروشوں کے نام سے افسانے کی شکل میں بھی شائع کیا گیا۔

ناول کے پہلے حصے ''سرخ فوارے'' میں فسادات کی وجہ سے لوگوں کی دہشت، خوف اور بد حواسی کو بیان کیا ہے۔ دوسرے حصے میں ''رقصِ شرر'' میں ہندو مسلم فسادات کی شدت، نفرت اور تعصب کی بنیاد پر قتل و غارت گری، لوٹ مار اور اغوا کے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ تیسرے حصے ''میں بچ گیا'' ہے میں بچ گیا ایک سکھ کا جملہ ہے جس نے مسلمانوں کے خوف سے اپنی بیوی اور بچوں کو قتل کر دیا تھا، اور پھر دیوانگی کے عالم میں وہ ہر وقت یہی جملہ دہراتا رہتا۔ ناول کے اس حصے میں فسادات کے نفسیاتی اثرات دکھائی دیے گئے ہیں۔ چوتھا حصہ ''اور انسان مر گیا'' میں انسانوں کے حیوان بننے کا ذکر کیا ہے۔

ناول کے پلاٹ میں کئی کمزوریاں ہیں۔ ناول کے چاروں حصے میں جو واقعات بیان کئے گئے ہیں ان میں تسلسل اور توازن کی کمی ہے۔ دوسری کمزوری یہ ہے کہ ناول میں واقعات کی بھرمار ہے کچھ واقعات ایسے ہیں جو ایک پیرا گراف یا ایک صفحے پر مشتمل ہیں، اسی وجہ سے ناول میں وہ دلچسپی اور تجسس پیدا نہیں ہو سکا۔ اس ناول کے بارے میں اسلم آزاد نے یہ رائے دی ہے :

''سرخ فوارے''، ''رقصِ شرر''، ''میں بچ گیا'' اور ''انسان مر گیا''، یہ چاروں حصے ایک ہی وقت میں مختلف جہتوں میں پھیلے نظر آتے ہیں، ان حصوں میں کوئی گہرا ربط نہیں ہے۔ جذباتی بیانات اور جذباتی تفصیلات نے ناول کو اثر انگیز بنا دیا ہے، لیکن فنی سطح پر کوئی ندرت اور فکری سطح پر گہرائی نہیں ملتی۔۲

ناول کی فضا ابتدا ہی سے سوگوار ہے۔ یہ سوگواری کبھی کسی کے گھر جلنے کی وجہ سے، کبھی کسی بچے کے قتل سے کبھی کسی عورت کی بے حرمتی کی وجہ سے، کبھی خاندان کے افراد کے بچھڑ جانے کی وجہ سے اور کبھی صدیوں پرانے وطن سے ہجرت کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔

افراد کے علاوہ مہاجر کیمپوں اور متاثرہ علاقوں کی فضا کا نقشہ بھی انہوں نے ایسا کھینچا ہے جس سے ناول میں اداس فضا نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ راما نند ساگر نے ناول میں لاہور کے بارے میں لکھا ہے: ''لاہور جو کبھی حسن کا مسکن تھا آج زخمیوں کی ایک بستی ہے، بلکہ خود لاہور مجھے ایک بڑا زخم دکھائی دیتا ہے۔ وہ زخم جس کا علاج کرنے والا کوئی نہ رہا۔'' ۳

ناول کے پہلے حصے کا عنوان ''سرخ فوارے'' ہے۔ اس حصے میں اہم کردار آنند ہے جو پورے ناول میں موجود رہتا ہے، اس کے علاوہ سیٹھ کیشن لال، اوشا اور دوسرے چھوٹے چھوٹے کردار بھی موجود ہیں۔

ناول کے اس حصے میں راما نند ساگر نے ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کے تعصب اور بدحواسی کو دکھایا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک وقعہ بیان کیا ہے جس میں انہوں نے ایک سانڈ کے زخمی ہونے کا ذکر کیا ہے: ''ایک سانڈ جب زخمی ہو کر بھاگا ہے تو کئی لوگ اس سے بچنے کے لئے بے تحاشہ بھاگ کھڑے ہوئے انہیں دیکھ کر ان سے آگے والے اور پھر اسی طرح بازار کے دوسرے سرے تک سب لوگ ایک دوسرے کو دیکھ کر بھاگنا شروع ہو گئے تھے۔۔ ایک ڈر جوان کی روحوں میں سما گیا تھا وہی انہیں بھگا رہا تھا۔'' ۴

اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فسادات کے دنوں میں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے خوف زدہ رہتے کہیں بھی شور ہوتا یا مجمع لگتا تو سب کو یہی شک ہوتا کہ کسی ہندو یا سکھ نے مسلمانوں پر حملہ کیا ہے۔ ناول کے اس حصے میں جو چیز سب سے نمایاں طور پر پیش کی گئی ہے وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا آپس میں تعصب ہے اور اس کا ذمے دار راما نند ساگر معاشرے کے اعلیٰ طبقے اور افسران کو ٹھہراتے ہیں۔

''ہندو ساہوکار اور مسلمان ساہوکار دونوں اپنے اپنے فرقوں کے معصوم نوجوانوں کو قومی نعروں کے جوش سے بھڑکا کر فسادات کی آگ میں شہید کرا رہے تھے۔ تاکہ ان کے اپنے مکان اور جائیداد سلامت رہ سکیں، اور دوسروں کے مکان اور جائیدادیں خاک کر دی جائیں۔ نظم و نسق کے حالات اتنے بگڑ چکے تھے کہ خود پولیس کے مسلمان اور ہندو افسر بھی اندرونی طور پر اپنے اپنے فرقوں کی مدد کر رہے تھے''۔ ۵

اس خیال کو راما نند ساگر نے لاہور کے ایک سیٹھ کشوری لال کے کردار کے ذریعے بیان کیا ہے۔ سیٹھ کشوری لال پیار محبت کے جذبات سے عاری ایک مفاد پرست آدمی ہے۔ جب تقسیم ہند کے بعد لاہور پاکستان کے حصے میں آیا تو اس نے مسلمانوں کے محلے سے بہ حفاظت نکالنے کے لئے محلے کے تمام ہندو نوجوانوں کے ساتھ دوستانہ رویہ اختیار کر لیا۔ ان نوجوانوں میں محلے کے مفلس اور انسان دوست شاعر آنند کو بھی شامل کر لیا گیا۔ جس سے کبھی کشوری لال اس کی غربت اور اپنی بیٹی اوشا کا عاشق ہونے کی

وجہ سے سخت نفرت کرتا تھا لیکن جب اسے اپنے مفاد کے لئے استعمال کرنے کا وقت آیا تو اس کے خیالات میں بھی تبدیلی آگئی اور وہ سوچتا: ''اگر اوشا چھپ چھپ کر اس سے مل بھی لے تو کیا ہرج ہے، آخر انسان کو ترقی پسند ہونا چاہیے''۔۶؎

اور اس طرح آنند جو مذہب اور قوم کی تفریق کے بغیر ہر انسان سے محبت کرتا تھا۔ اسے مجبوراً اوشا کے لیے ہندو بن کر سوچنا پڑا، اور ہندو قوم کے فرد کی حیثیت سے اسے اپنی باری پر ہندوؤں کی حفاظت کے لئے رات بھر جاگ کر پہرا دینا پڑتا۔

ناول کے اسی حصے میں ہندو مسلم تعصب کو واضح کرنے کے لئے ایک ہندو اور مسلمان لڑکے کی دوستی کا ذکر کیا ہے۔

فسادات کے دنوں میں ہندو لڑکا مسلمانوں کے علاقے سے جان بچا کر اپنے مسلمان دوست کے گھر پناہ لینے گیا، لیکن دوستی، محبت اور لحاظ کا دور ختم ہو چکا تھا اور مسلمان لڑکے نے اپنے قتل ہونے والے بھائیوں کا بدلہ اپنے ہندو دوست سے لینے کا ارادہ کرتے ہوئے کہا: ''مارنے والے تمہارے مذہبی بھائی تھے۔ جس طرح اپنے مقتول بھائیوں کے خون کا بدلہ لینا مجھ پر فرض ہے۔ اسی طرح اپنے بھائیوں کے عمل کا خمیازہ تمہیں بھگتنا پڑے گا۔'' ۷؎

اس موقع پر ہندو لڑکے نے چالاکی سے کام لیا اور اپنے مسلمان دوست سے کہا کہ وہ اس کی آخری خواہش پوری کرے۔ مسلمان لڑکا پرانی دوستی کا پاس رکھتے ہوئے اس کے لئے مٹر پلاؤ لینے گیا لیکن جب وہ واپس آیا تو ہندو لڑکے نے اسے قتل کر دیا۔

فساد کے دنوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیاں تعصب کی انتہا ظاہر کرنے کے لئے ناول میں ایک اور واقعہ بیان کیا گیا ہے، جس میں ایک ہندو نے ایک مسلمان کو بھاری رقم دے کر مسلمانوں کے علاقے سے بحفاظت نکالنے کے لئے کہا تھا جب وہ ہندؤں کے علاقے میں پہنچے تو متعصب ہندو لڑکوں کی ایک ٹولی نے اصل صورتِ حال جانے بغیر ہی تانگے والے پر خنجر سے وار کر دیا لیکن جب وہ فوراً نہیں مرا تو ہندوؤں نے تانگے کو آگ لگا دی۔ اچانک انہیں احساس ہوا کہ مسلمان آدمی کے ساتھ گھوڑا بھی جل جائے گا۔ جس کا تعلق کسی قوم یا مذہب سے نہیں ہے۔ اس لئے انہوں نے گھوڑے کو فوراً کھول دیا۔ رحم دلوں نے اسے ٹھنڈا پانی پلایا اور اس کی مرہم پٹی کی۔

ناول کا ہیرو آنند متعصب ہندوؤں کے درمیان گرا ہوا تھا، لیکن اس کے باوجود آنند کو اپنی فطرت کے مطابق ہر ظالم سے نفرت اور ہر مظلوم سے ہمدردی تھی۔

جب ہندوؤں نے شمس الدین کے گھر کو آگ لگائی تو آنند نے بہت کوشش کی کہ اس کے ساتھی اس کے ساتھ مل کر آگ بجھائیں لیکن کوئی بھی اس کام کے لئے تیار نہ ہوا تو آنند شمس الدین کے جلتے ہوئے

مکان میں چلا گیا۔

آنند کی وجہ سے عورتوں اور بوڑھوں میں ایک ہاہاکار مچ گیا تھا اور نوجوان مجبور ہو کر پانی کی بالٹیاں لیے اِدھر سے اُدھر بھاگنے لگے تھے لیکن آگ ان کے قابو سے باہر ہو چکی تھی۔

آنند کے پہنچنے سے پہلے شمس الدین کا گھر کافی حد تک جل چکا تھا لیکن اس کے جانے کا اتنا اثر ہوا کہ اس کے ساتھیوں نے آنند کی خاطر مکان پر پانی کی بالٹیاں ڈال کر آگ بجھا دی اور یوں آنند نے اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر شمس الدین اور اس کے گھر والوں کی جان بچالی۔

ناول کے دوسرے حصے کا عنوان ''رقصِ شرر'' ہے۔

اس حصے میں بھی رامانند ساگر نے لاہور میں ہونے والے ہندو مسلم فسادات کا ذکر کیا ہے۔ ہندوستان میں جب زخمیوں یا مردہ مہاجرین سے بھری ہوئی ٹرینیں آتیں تو ہندو اور سکھ ان کا بدلہ لینے ہندوستان سے ہجرت کرنے والے مسلمانوں سے لیتے۔ اسی طرح جب پاکستان میں مسلمان شہیدوں سے بھری ہوئی ٹرینیں آئیں یا کسی اور ذریعے سے مسلمانوں پر کیے جانے والے ظلم کی خبریں پاکستان پہنچتیں تو مسلمان اپنے ساتھیوں کے لئے جذباتی ہو جاتے اور جو بھی ہندو یا سکھ سامنے نظر آتا اس سے اپنے ساتھیوں کا بدلہ لیتے۔

''ایک ڈبے کی دیوار پر کسی نے خون کے ساتھ لکھ دیا۔۔'' راول پنڈی کا جواب، اور اس ڈبے پر چھائی ہوئی موت کی خاموشی زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ ''ان کو روکو۔ جونوا کھالی کا جواب بہار میں اور بہار کا جواب راول پنڈی میں دیتے ہیں''۔8

ہندو، سکھ یا مسلمان جب بھی اپنے نقصان کا بدلہ لینے کا ارادہ کرتے تو خواتین ہی سب سے پہلے ان کے ظلم اور ہوس کا نشانہ بنتیں۔ اس حقیقت سے خواتین بھی اچھی طرح آگاہ ہو چکی تھیں۔

''آدھی کے قریب خواتین نے خودکشی کر لی تھی اور جو باقی تھیں وہ کچھ اس طرح سہم گئی تھیں کہ انہیں اپنے مردوں پر بھی اعتبار نہ رہا تھا۔ جو مرد اپنے گاؤں کی ہر لڑکی کو بیٹی سمجھا کرتے تھے۔۔۔اور جن بزرگوں نے ان کی ماؤں اور دادیوں کی عزت کی ہمیشہ حفاظت کی تھی ان ہی مردوں نے آج ان کے ساتھ وہ کچھ کیا تھا کہ اب وہ ہر مرد سے دہشت کھانے لگی تھیں''۔ 9

سکھ، ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے بدلہ لینے کے نشے میں اتنا غرق ہو جاتے کہ انہیں آس پاس کا ہوش نہ رہتا، یہاں تک کہ وہ اپنے مصیبت زدہ بھائیوں کو بھی بھول جاتے جو ان کی مدد کے منتظر ہوتے۔

ناول میں ایک جگہ ایک زخمی مسلمان مہاجر نے پلیٹ فارم پر کسی رضاکار سے ہسپتال لے جانے کے لیے مدد مانگی تو اُس نے ڈانٹتے ہوئے کہا: ''۔۔۔تو یہ ہم کس کی مدد کر رہے ہیں۔ اپنے باپ کی؟

اس وقت سو۱۰۰ کے قریب ہندو اس اسٹیشن پر قتل کیے جا چکے ہیں اور آپ کا مزاج ہی کہیں نہیں ٹھہرتا۔'' ۱۰

ناول کے اس حصے میں بھی کشور لال کی بے حسی دکھائی گئی ہے۔ جسے شدید فسادات کے دنوں میں اپنی بیوی اور بیٹی کی عزت اور زندگی سے زیادہ اپنی زندگی اور اپنی دولت بچانے کی فکر تھی۔

جب مسلمانوں نے کشوری لال کے گھر پر حملہ کیا تو اس نے صرف روپے پیسے اور سونا چاندی ہی کو اپنا قیمتی سرمایہ سمجھا، اور اسی سرمائے کے سہارے وہ ایک محفوظ مقام پر پہنچ گیا۔

آنند نے جب اس سے اوشا اور اس کی بیوی کے بارے میں پوچھا تو اس نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا: ''اس وقت اتنی فرصت ہی کہاں تھی کہ میں ان کو ڈھونڈتا پھرتا۔ ہزار جلدی کرنے پر بھی نوٹوں کی چند گڈیاں رہ گئیں۔ آخر روپیہ کیسے چھوڑا جا سکتا ہے،۔۔۔ جیب ٹھوس ہو تو بیوی کی کیا کمی ہے۔'' ۱۱

ناول کے اسی حصے میں ایک مولانا کے کردار کا بھی اضافہ ہوا ہے جس نے آنند کو مسلمان حملہ آوروں سے بچایا اسے اوشا سمیت تین مغویہ لڑکوں سے ملوانے کے بعد بحفاظت ریلیف کیمپ تک پہنچایا۔

آنند ریلیف کیمپ میں ان تینوں لڑکیوں کی حفاظت خود کرنا چاہتا تھا۔ آنند اس بات سے بہت خوش تھا کہ اوشا کیمپ میں اس کے ساتھ ہوگی، لیکن آنند کا یہ ارمان پورا نہ ہو سکا، اور ریلیف کیمپ میں اوشا کا باپ پہلے سے موجود تھا۔

کیمپ میں بیٹھ کر کشوری لال خود کو شفیق اور ذمے دار باپ ظاہر کرنے کے لئے اوشا کے ساتھ سائے کی طرح رہتا۔ جس سے اوشا اور آنند کی آپس میں بات نہ ہو پاتی۔ سارے حالات جانتے ہوئے بھی اوشا کے دل میں یہ غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کے اغوا کرنے کی وجہ سے آنند اس سے دور ہو گیا۔

جب کیمپ سے قافلے کے جانے کا وقت آیا تو آنند نے قافلے والوں کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا کیوں کہ آنند لاہور میں رہ کر بلا تعصب مصیبت زدہ لوگوں کی خدمت کرنا چاہتا تھا۔ اوشا کو یقین ہو گیا کہ آنند اس سے اس لئے نفرت کرنے لگا ہے کیونکہ مسلمانوں نے اسے اغواء کر لیا تھا، اوشا نے آنند کو صفائی کا موقع نہ دیا اور زہر کھا کر مر گئی۔

اوشا کے کردار سے ان مغویہ خواتین کی نفسیاتی الجھنوں کی ترجمانی ہوتی ہے جنہوں نے لوگوں کے تحقیر آمیز رویے اور دل دکھانے والے سوالوں سے خوف زدہ ہو کر خودکشی کی۔

اوشا کی موت کے بعد ناول کا تیسرا حصہ ''میں بچ گیا'' شروع ہوتا ہے جس میں آنند اوشا کی موت کے بعد افسردہ ہے۔

ناول کے اس حصے میں ''کشن چند'' کے کردار کا اضافہ ہوا ہے جس کی بہن کو مسلمان اغوا کر

کے لے گئے تھے۔ اس کا شوہر اس کی حفاظت کرتے ہوئے پہلے ہی مارا جا چکا تھا۔ اغوا کرنے والوں کی بہن کی گود سے یہ کہہ کر اس کا بچہ چھین لیا تھا: ''۔۔۔اس سرٹیفکیٹ کو ساتھ کہاں لیے جا رہی ہو۔ اس کے ساتھ تو تمہاری قیمت آدھی ہو جائے گی۔'' ۱۲؎

کشن چند نے یہ بچہ آنند کے حوالے کر دیا تھا۔ اب یہ بچہ ہی آنند کا دوست اور دکھ درد کا ساتھی تھا۔ ناول کے تیسرے حصے میں نرملا کے کردار کا بھی اضافہ ہوتا ہے۔ نرملا ایک مظلوم باہمت لڑکی ہے۔ فسادات میں مسلمان اسے اغوا کر کے پاکستان لے جاتے ہیں۔ اپنی بہادری سے وہ مسلمان کی قید سے نکل جاتی ہے اور دریائے راوی پار کر کے دوبارہ ہندوستان کی سرحد میں داخل ہو جاتی ہے، لیکن اس کے گھر والوں نے اسے دروازے ہی سے یہ کہہ کر واپس بھیج دیا تھا کہ انہوں نے اپنے خاندان اور محلے میں یہ مشہور کر دیا ہے کہ ان کی بہو غیرت مند تھی اس لیے اس نے کنویں میں چھلانگ لگا کر عزت بچانے کے لئے اپنی جان قربان کر دی تھی۔

نرملا کے سسر نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا: ''ہم نے ان سے پورا پورا بدلہ لے لیا ہے۔ جتنی عورتیں ہمارے گاؤں کی وہ اٹھا کر لے گئے ہیں ان سے کہیں زیادہ ہم ان کی عورتیں گاؤں میں لے آئے ہیں۔۔۔اپنے ہاں بھی دو ہیں۔'' ۱۳؎

نرملا سے مجبوراً اور مایوس ہو کر دوبارہ دریائے راوی پار کیا اور پاکستان میں آ گئی۔ جہاں آنند کو وہ بے حوشی کی حالت میں ملی۔ جب اسے ہوش آیا تو وہ اپنے حواس کھو بیٹھی تھی۔ آنند کی کئی دنوں کی کوشش کے بعد اس کے حواس درست ہوئے تو اس نے اپنی پوری کہانی آنند کو سنائی۔ کہانی سنانے کے بعد وہ جس نتیجے پر پہنچی اسے راما نند ساگر نے بہترین الفاظ میں یوں بیان کیا ہے:

''شریف عورت کے لئے ہندوستان میں بھی مجھے وہی کچھ دکھائی دیا جو اُن کے پاکستان میں تھا۔ یہ دنوں ملک ان مردوں کے تھے جنہوں نے شرافت کے نقلی پردے پھاڑ کر اپنے اصلی رنگ میں عورت کے ننگے جسم کے گرد ناچنا شروع کر دیا تھا۔۔۔اس عیاشی کے لئے دونوں ایک دوسرے سے مل گئے تھے، اور میں ان دونوں کی پہنچ سے کہیں دور چلی جانا چاہتی تھی۔'' ۱۴؎

یہ ساری باتیں سن کر آنند کو نرملا سے ہمدردی محسوس ہوئی اور اس کے ساتھ ہی اسے اوشا یاد آ گئی۔ اسے نرملا اوشا ہی کا کوئی روپ لگی۔ اس نے کشن چند کا بھانجا نرملا کے حالے کر دیا تا کہ اسے اپنے بیٹے کی کمی محسوس نہ ہو۔

نرملا نے بھی اس بچے کو فوراً اپنا بیٹا تسلیم کر لیا اور اس میں مگن ہو کر وہ کسی حد تک اپنا دکھ بھول گئی۔ ناول کے اس حصے میں اجاگر سنگھ کا کردار یہ ظاہر کرتا ہے۔ فسادات کے دوران مسلمانوں نے بھی سکھوں پر ہر طرح کے ظلم کیے۔

اجا گر سنگھ راول پنڈی کا رہنے والا تھا۔ جب اس کے آس پاس دیہاتوں میں سرحد کے مسلمانوں نے حملہ کیا تو اجا گر سنگھ کے گاؤں کے لوگوں نے بھی خود کو مرنے کے لئے تیار کر لیا۔

''گاؤں والوں نے مشورہ کر کے یہ فیصلہ کیا کہ اپنی عورتوں کی عزت یقینی طور پر بچانے کے لئے اپنے اپنے گھروں کی عورتوں کو خود اپنے ہی ہاتھوں قتل کر دیا جائے۔ تاکہ ایک فی صد بھی کھٹکا باقی نہ رہے''۔۱۵

اجا گر سنگھ جب اپنی بیوی اور بچوں کو مارنے کی نیت سے گھر داخل ہوا تو اس کی بیوی خود کو مرنے کے لئے آمادہ کر چکی تھی۔ اندر جا کر عورت نے چپ چاپ ایک لکڑی کے صندوق پر سر رکھ دیا؛ آنکھیں بند کیں اور کہا،

'' واہگرو۔'' اس لفظ کے ساتھ اس کا سر تن سے جدا ہو گیا۔۱۶

اس ناول میں رامانند ساگر نے جو ایک نیا نکتہ بھی پیش کیا ہے وہ ایک بچے پر فسادات کے نفسیاتی اثرات کو بیان کرنا ہے۔ اس بچے کا ننھا ذہن ہندو مسلم فسادات کی وجوہات سے تو ناواقف ہے لیکن آس پاس کے ماحول نے اسے یہ احساس دلا دیا تھا کہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے دشمن ہو چکے ہیں اور ان کی خوشی ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے میں ہے۔ وہ خود بھی مرنے کے لئے تیار تھا۔ جب اجا گر سنگھ اپنے گھر والوں کو مارنے کی نیت سے گیا تو اس بچے نے اپنی روتی ہوئی ماں کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا:

''ماں تو کیوں فکر کرتی ہے۔ آنے تو دے کسی مسلمان کو، میں یہ برچھا تیار کر رہا ہوں، بس اسی سے ایک ایک کا خون کر دوں گا۔''۱۷

بیٹے نے اپنی ماں کو قتل ہوتے دیکھ لیا تھا اس لئے جب اجا گر سنگھ نے اسے لیٹنے کے لئے کہا تو وہ اپنے باپ کا مقصد سمجھ گیا اور اس نے کہا: ''ماں تو کہتی تھی ہمیں مسلمان مار ڈالیں گے، پھر تم کیوں مارتے ہو؟ کیا تم مسلمان ہو گئے ہو۔'' ۱۸

اجا گر سنگھ نے بیٹے کے قتل کے بعد بیٹی کو بھی قتل کر دیا اور پھر مسلمان حملہ آوروں کے گروہ کا مقابلہ کرنے کے لئے گاؤں کے ہندوؤں کے ساتھ مل گیا۔

مسلمان حملہ آور جب گاؤں میں داخل ہوئے تو تمام سکھ مقابلے کے لئے ان کے سامنے آ گئے لیکن اس سے پہلے کہ مقابلہ شروع ہوتا۔ فوجیوں کا ایک دستہ ان کے گاؤں میں آ گیا اور ان سکھوں کو راول پنڈی کے کیمپ میں لے گیا۔

اجا گر سنگھ بھی اپنے ہاتھوں ہی اپنے گھر کو اجاڑنے اور دشمنوں سے مقابلہ نہ کرنے کے دکھ میں پاگل ہو گیا، اس نے کرپان پھینک دی۔ البتہ اپنے بیٹے کے بنائے ہوئے برچھے کو اپنے پاس ہمیشہ کے لئے رکھ لیا اور ہر وقت ''میں بچ گیا'' کے نعرے لگاتا رہتا۔ اس دیوانگی کی حالت میں اس نے قافلے کے ساتھ

پاکستان سے ہندوستان ہجرت کی۔

ناول کے چوتھے حصے ''انسان مر گیا'' میں ہندوؤں کا طویل قافلہ ہجرت کی منازل طے کرتا ہوا ہندوستان کی سرحد میں پہنچ جاتا ہے۔شرنارتھیوں کے کیمپ کی تصویر ملاحظہ فرمایئے:

''وہاں مختلف قسم اور مختلف علاقوں کے لوگ آکر جمع ہو گئے تھے۔ان میں اکثر توان دور افتادہ دیہات کے تھے جہاں مکمل قتل عام ہوا تھا،اور کوئی ایک آدھ کسی طرح بچ بچا کر بھاگ آیا تھا۔کچھ ایسے بھی تھے جو قافلوں سے بچھڑ گئے تھے، تھک کر بیٹھ گئے تھے، بیمار ہو گئے تھے،اور قافلے والے انہیں چھوڑ کر اس طرح آگے چلے گئے تھے۔ یہ سب بھٹکے ہوئے، بچھڑے ہوئے لوگ، جن میں سے ہر ایک اکیلا تھا، یہاں آکر جمع ہو گئے تھے۔ان میں کوئی بھی کسی کا کچھ نہ تھا''۔۱۹

اس قافلے میں آنند، نرملا، بے سہارا بچہ، اجاگر سنگھ، کشن چندر بھی شامل ہیں۔اس حصے کی ابتدا میں رامانند ساگر نے انسانیت کا درس دینے کی کوشش کی ہے ان کے بعض خیالات متاثر کن بھی ہیں جن میں انہوں نے ان ہندوؤں اور مسلمانوں پر طنز کی ہے جو انسانی تہذیب اور انسان اور حیوان کے فرق کو بھول چکے تھے۔

''۔۔۔انسانیت، ننگی ہو گئی تھی۔ مذہب کا پول کھل گیا تھا اور انسان اپنے اصل رنگ میں نمودار ہو گیا تھا۔اس نے ہزاروں، لاکھوں برسوں کی روایات کے زور پر بنے ہوئے تمام رشتے توڑ دیے تھے''۔۲۰

ہجرت کرنے والے قافلے کا ہر فرد کسی نہ کسی تکلیف میں مبتلا تھا۔سب کو اپنے آپ کے علاوہ کسی سے دلچسپی نہ رہی تھی۔ بھوک، پیاس، تھکن اور ہجرت کے غم نے سب کو بری طرح نڈھال کر دیا تھا۔ کشن چندر کا بھانجا بھی بھوک سے مر چکا تھا۔اب نرملا اور آنند اس کی لاش کی حفاظت بھی ایسے ہی کر رہے تھے جیسے کسی زندہ انسان کی جاتی ہے۔ جیسے جیسے قافلے میں بھیڑ بڑھتی جارہی تھی قافلے کی بدنظمی بھی بڑھتی جارہی تھی۔ نرملا اور آنند کو ڈر تھا کہ کسی بھی لمحے بچہ ان کے ہاتھ سے گر کر کچل جائے گا۔ دونوں نے متفقہ فیصلے کے بعد اسے ایک درخت کے نیچے رکھ دیا اسے دیکھ کر بہت سے کتے اس کی طرف دوڑے لیکن اس سے پہلے لاش کو کوئی نقصان پہنچتا آنند نے دوبارہ اس بچے کو اٹھالیا۔

جب قافلہ ہندوستان سے چند میل دور رہ گیا تو قافلے والوں کو خبر پہنچی کہ جواہر لال نہرو ان کی حفاظت کے لئے ملٹری اور ہوائی جہاز سے ان کے لئے روٹیاں بھیجیں گے، لیکن آنند کو ان باتوں پر یقین نہ آیا اور اس نے کہا:''۔۔۔آخر جواہر لال نہرو ہمارے کیا ہوتے ہیں تم نے دیکھا نہیں یہاں جو اپنے قریبی رشتے دار ہیں وہ ایک دوسرے کو سڑک پر چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔۔۔ ہاں البتہ ایک بات ہو سکتی ہے اسے کوئی غرض ہو گی۔ شاید اسے ان سب لوگوں سے ووٹ لینے ہوں گے۔'' ۲۱

اور جب ہوائی جہاز سے روٹیاں پھینکیں گئیں تو قافلے میں ایسی ہلچل مچ گئی جیسے روٹیاں نہیں بم پھینکے جارہے ہوں۔لوگ ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہوئے اور روندتے ہوئے روٹی چھیننے کی کوشش کررہے تھے۔

''ایک عجیب دل ہلادینے والا سماں تھا۔ جنہیں کچھ ٹکڑے مل گئے تھے وہ خوشی کے مارے رو رہے تھے۔۔روٹیاں پیروں تلے کچلی گئیں۔۔۔آدمی اور بچے بھی ان کے ساتھ اس طرح کچلے گئے تھے۔ ایک طرف ان کی چربی اور دوسری طرف خون میں کچلی ہوئی روٹیوں کے آٹے میں تمیز کرنا بہت مشکل ہو گیا تھا''۔ ۲۲

اسی دھکم پیل میں نرملا کے ہاتھوں سے بچہ بھی گر گیا جو سے دوبارہ نہ مل سکا۔اس طرح وہ بچہ جس کی لاش کو آنند کتوں اور گدھوں سے بچالایا تھا اسے انسانوں سے نہ بچا سکا۔

جیسے جیسے قافلہ آگے بڑھتا جارہا تھا ان کی منزل قریب آتی جارہی تھی، منزل پر پہنچنے کی خوشی اور اچھے مستقبل کی امید نے انہیں اتنا طویل سفر آسانی سے کٹ گیا تھا۔

نرملا آنند کے ساتھ نئی زندگی شروع کرنے کے خواب دیکھ رہی تھی، اور پھر وہ وقت بھی آگیا جب نرملا نے سلیمانکی کا پل پار کرکے ہندستان کی سرحد پر اپنا قدم رکھا۔اس لمحے اسے ایسا محسوس ہوا جیسے :''۔۔۔آدم خوروں، راکھشسوں کی بستی سے نکل کر وہ دیوتاؤں کی دھرتی پر قدم رکھ رہی ہو''۔۲۳

ہندوستان کی سرحد پر پہنچنے تک آنند نیم پاگل ہو چکا تھا۔نرملا تمام حادثات کے باوجود زندگی کی متمنی تھی۔آنند زندگی سے اتنا ہی متنفر ہو چکا تھا، اور اسے ایسے بہت سے مواقع یاد کرکے افسوس ہو رہا تھا جب اس نے زندہ رہنے کے لئے خطرات کا مقابلہ کیا تھا۔

آنند نرملا کے ساتھ پل پار کر چکا تھا کہ پیچھے سے مولانا نے آواز دی اور ایک لاوارث ہندو بچہ اس کے حوالے کر دیا تو آنند نے نہایت غصے سے مولانا کو مخاطب کرکے کہا: ''تم اتنے ظالم کیوں ہو گئے ہو؟ تم تو چاہتے ہو کہ یہ بھوک اور پیاس سے تڑپ تڑپ کر مرے اور پھر جب اس کی ماں ملے اس کی چھاتیاں کٹ چکی ہوں۔'' ۲۴

اگلے ہی لمحے آنند نے مولانا کی گردن دبادی، دونوں طرف کی فوجوں نے فائرنگ کی لیکن انسان (مولانا) مر چکا تھا۔ رامانند ساگر کے اس ناول میں ہندو مسلم فسادات کی وجہ سے پیش آنے والے مختلف حادثات کو بیان کیا گیا ہے۔ فنی کمزوریوں کے باوجود بعض واقعات نے ناول میں جان ڈال دی ہے۔ مولانا، آنند، اوشا، نرملا اور اجاگر سنگھ جن حادثات کا شکار ہوئے اس کے نتیجے میں ان کا صرف جانی، مالی اور روحانی نقصان ہی نہیں ہوا، بلکہ ان حادثات سے ان کی شخصیت بھی بُری طرح متاثر ہوئی۔

تمام واقعات میں ناول نگار نے خود کو غیر جانب دار ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، اور انسانیت

کا درس دے کر خود کو سوشلسٹ ظاہر کرنا چاہ رہے ہیں۔ ایک جگہ انہوں نے ناول کے مرکزی کردار آنند کے ذریعے اپنا خیال پیش کیا ہے: ''اس فساد میں نہ ہندو کا کچھ بگڑا۔ نہ مسلمان کا نقصان ہوا۔ دونوں نے اِدھر کا نقصان اُدھر سے پورا کر لیا۔ صرف نقصان ہوا تو انسان کا، اور لٹ گئی تو انسانیت''۔ ۲۵

انہوں نے ناول میں بعض جگہ ہندوؤں کو اور بعض جگہ مسلمانوں کو وحشی ثابت کرنا چاہا ہے اور اس طرح حساب برابر رکھنے کی کوشش کی ہے، پھر بھی وہ اپنے دل میں مسلمانوں کے خلاف چھپی ہوئی نفرت اور تعصب کو چھپانے میں ناکام ہو گئے ہیں۔

فسادات کے دنوں میں مولانا نے تین ہندو لڑکیوں کو محفوظ جگہ چھپا کر رکھا تھا اور بعد میں انہیں آنند کے حوالے کر کے کیمپ تک پہنچایا تھا، اور انہیں یقین دلایا تھا کہ خدا ان کی حفاظت کرے گا۔ اس موقع پر انہوں نے خدا پر طنز کرتے ہوئے لکھا ہے:

''آپ اپنی عظمت خواہ مخواہ خدا کے سر تھوپ رہے ہیں اگر آپ کا خدا ہی ان کی حفاظت کرتا ہے تو دیکھیے آسمان پر چھایا ہوا دھواں اور اُدھر زمین پر بہنے والا خون بھی دیکھیے۔ خدا شاید یہی کچھ کر سکتا ہے۔ مگر جو آپ نے کیا ہے۔ ایسا عظیم کام وہ نہیں کر سکتا۔ یہ ایک انسان ہی کر سکتا تھا۔'' ۲۶

آخر میں جب مولانا اسلام کو ایک آئیڈیل مذہب ثابت کرنے میں کام ہو گئے۔ تو انہوں نے اسلام کے ساتھ ہندومت کو بھی عظیم مذہب قرار دیا۔

''وہ مہادیوں کے سر سے نکلنے والے گنگا کی طرح پوتر اور ناقابل تسخیر ہے۔'' ۲۷

ناول میں ایک جگہ لٹے پٹے مسلمان مہاجرین کی ٹرین کا ذکر کیا ہے جس کے صرف پندرہ مسلمان زندہ سلامت بچے ہیں ان مہاجرین کو غیر مہذب اور ندیدہ ظاہر کرنے کے لئے ایک غیر حقیقی بیان دیا ہے: ''ان پندرہ افراد نے بے حد بھوک اور پیاس کے سبب فرش پر جمے ہوئے اپنے بھائیوں، بیویوں اور بچوں کے خود کو چاٹا تھا۔ اپنے بدن میں دانتوں سے کاٹ کر خون چکھا تھا اور انتہا یہ ہے کہ کئی روز سے پیاسے رہنے کے بعد آخر انہوں نے ایک دوسرے کے منہ میں پیشاب کیا تا کہ حلق تو تر کر سکیں''۔ ۲۸

مغربی پنجاب سے جانے والی ہندوؤں اور سکھوں کی ٹرین کے بارے میں انہوں نے لکھا ہے:

''مغربی پنجاب سے آئی ہوئی ایک فوجی رفیوجی ٹرین کو منٹگمری اور رائے ونڈ سے ہو کر لاہور پہنچنے میں پانچ دن لگے تھے۔ اس میں دس ہزار سکھ تھے۔ ان پر کئی مرتبہ حملے کیے گئے اور محافظ دستوں نے بڑی بہادری سے انہیں بچایا، لیکن پیاس سے انہیں کوئی نہ بچا سکا۔ راہ میں پاکستان کے کسی بھی اسٹیشن پر تین دن تک انہیں پانی کا ایک گھونٹ نہ دیا گیا جس سے چار سو ننھے بچے بلک بلک کر مر گئے''۔ ۲۹

ان اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ رامانند ساگر ہندوؤں اور مسلمانوں کو انسان کی حیثیت سے نہیں، بلکہ وہ مختلف قوموں کی حیثیت سے دیکھتے تھے۔ اپنے دل میں چھپی ہوئی نفرت کو انہوں نے نہایت

غیر شائستہ اور سطحی انداز میں بیان کیا ہے۔

کوئی بھی مسلمان یا مہذب انسان اتنا بے صبرہ یا ندیدہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی پیاس بجھانے کے لیے اپنے ساتھیوں کا خون یا پیشاب پیے۔ البتہ اگر یہ بات ہندوؤں کے بارے میں کہی جاتی تو اس بات پر بغیر کسی شک وشبہ کے یقین کیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ جس قوم کے مذہب میں گائے کا پیشاب پینے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ وہاں کسی انسان کا پیشاب پینا ناممکن نہیں۔

ناول کے آخر میں انہوں نے اپنے متعصبانہ جذبات کے ہاتھوں مجبور ہو کر نرملا کی دلی کیفیت کے ذریعے ظاہر کر دیا ہے: ''آدم خور راکھشسوں کی بستی سے نکل کر وہ دیوتاؤں کی دھرتی پر قدم رکھ رہی ہو۔'' ۳۰

پورا ناول پڑھنے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ رامانند ساگر ناول کے ذریعے مسلمانوں کو ہی ظالم اور جابر ثابت کرنا چاہ رہے ہیں۔ ان کے نزدیک ہندو بے قصور اور مظلوم اور سارے فسادات کے ذمے دار مسلمان ہیں۔

اس لحاظ سے خواجہ احمد عباس کا یہ بیان بھی غلط ثابت ہو جاتا ہے جو انہوں نے ناول کے دیباچے میں لکھا ہے: رامانند ساگر کسی پارٹی کا ممبر نہیں ہے۔ اگر کمیونسٹ ہوتا تو سامراج اور سرمایہ داری پر لعنت بھیج کر چپ بیٹھا رہتا یا موضوع سخن بدل کر تلنگانہ کے بہادر چھاپہ ماروں کا ذکر شروع کر دیتا۔

''سوشلسٹ ہوتا تو کمیونسٹوں کی پاکستان پروری کو گالیاں دے کر ڈسٹرکٹ بورڈ کے الکشنوں میں مصروف ہو جاتا۔ کانگریسی ہوتا تو مسلم لیگ والوں کی صلواتیں سنا کر شراب بندی کا پرچار شروع کر دیتا۔۔ وہ کسی پارٹی کا ممبر نہیں۔ صرف انسان پارٹی سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ انسانیت کے علم بردار فن کاروں کی اس بلند مرتبت صف کا ایک رکن ہے''۔ ۳۱

اس پیرا گراف میں خواجہ احمد عباس نے جانب داری سے کام لیا ہے۔ یہ محض ان کا خیال ہے کہ رامانند ساگر انسان دوست ہیں۔

اگرچہ ناول کے شروع میں رامانند ساگر نے جو واقعات بیان کیے ہیں وہ کسی حد تک کام یاب بھی ہو گئے ہیں۔ لیکن جیسے جیسے ناول کی کہانی آگے بڑھتی ہے اس میں انہوں نے ایسے واقعات بیان کر دیے ہیں جن سے ان کے دل میں مسلمانوں سے نفرت کا جذبہ ظاہر ہو گیا ہے۔

ان واقعات سے ناول کی ادبی حیثیت بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ اگرچہ ناول میں انہوں نے بعض جگہ اپنے آپ کو غیر جانب دار اور انسان دوست ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے لیکن جب پورے ناول کا جائزہ لیا جائے تو نفرت، تعصب اور جانب داری جگہ جگہ نمایاں ہوتی ہے، اور فلسفہ انسانیت محض لفاظی بن کر رہ جاتا ہے، اور یہ ناول ایک ادبی تخلیق سے زیادہ ایک سیاسی پروپیگنڈا لگتا ہے۔ اور ہم ڈاکٹر وقار عظیم

کے ان خیالات سے اتفاق کرتے ہیں کہ :

''فسادات کے ان ناولوں میں جابجا اخلاقی درس اور اصلاحی اشارے بھی ہیں۔ انسانیت کی بلند قدروں کی منور کرنیں بھی کہیں کہیں جھلکتی اور چمکتی ہیں اور بلاشبہ کہیں کہیں فن کی لطافت بھی اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ لیکن مجموعی حیثیت سے فسادات کے سب ناول، ناول کے فن کے اندر کا جذباتی اور اس لئے انتہائی کمزور اور غیر فنی نقوش ہیں''۔ ۳۲

البتہ ڈاکٹر ممتاز کے ان خیالات سے مکمل طور پر اتفاق نہیں کیا جاسکتا کہ :''۔۔۔ رامانند ساگر کا ناول اور انسان مر گیا فسادات کی ہولناکیوں پر ہے۔ انہوں نے اس میں کرشن کی طرح کسی ایک قوم کو یک طرفہ طور پر مورد الزام نہیں ٹھہرایا بلکہ ان لوگوں پر وار کیا ہے جو انسانیت کے مجرم ہیں اور ان لوگوں کو سراہا ہے جو انسانیت کے زیور ہیں''۔ ۳۳

یہ ناول پڑھ کر ذہن میں یہ خیال بھی آتا ہے کہ جب ایک ادبی فن کار کے دل میں متعصبانہ خیالات پرورش پاسکتے ہیں تو عام ہندوؤں کے ذہن میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کے کیا کیا جذبات ہوں گے، اور ان منفی جذبات کی تکمیل کے لیے وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لیے کیا کیا ہتھکنڈے آزماتے ہوں گے۔

انہوں نے اسلام اور ہندومت کو بھی عظیم مذاہب قرار دیا ہے مگر یہ بھی محض نعرے بازی اور کھوکھلا تجربہ ہے۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ اگر دونوں اپنے مذہب پر عمل کر رہے ہوتے تو ایسے درندے کیوں کر ہو جاتے کیوں کہ کوئی مذہب اس درندگی کی تعلیم نہیں دیتا۔ دراصل اس عہد میں غیر جانب دار ہونا اور محض انسان ہونا ایک فیشن بن گیا تھا۔ رامانند ساگر اس فیشن کا شکار ہوئے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ انسان ہونے کے باوجود اپنا ہندو ہونا چھپا نہ سکے۔

کتب حوالہ:

۱۔ اردو ناول کا ارتقاء، مرتبہ، ڈاکٹر اسلم آزاد، ڈاکٹر فقیر حسین، ص ۳۰، بک ٹاک، لاہور، ۲۰۱۴

۲۔ اردو ناول آزادی ہے بعد ڈاکٹر اسلم آزاد، سیمانت پرکاشن، نئی دہلی، ۱۹۹۰، ص ۱۰۷

۳۔ اور انسان مر گیا، رامانند ساگر، مکتبہ شعر و ادب، لاہور، سن ندارد، ص ۲۱۸

۴۔ ایضاً ص ۲۴

۵۔ ایضاً ص ۱۶

۶۔ ایضاً ص ۱۷

۷۔ ایضاً ص ۲۵

۸۔ ایضاً ص ۳۸

۹۔ ایضاً ص ۴۱

۱۰۔ ایضاً ص ۴۵

۱۱۔ ایضاً ص ۵۲

۱۲۔ ایضاً ص ۹۰

۱۳۔ ایضاً ص ۱۰۱

۱۴۔ ایضاً ص ۱۰۱

۱۵۔ ایضاً ص ۱۱۵

۱۶۔ ایضاً ص ۱۱۷

۱۷۔ ایضاً ص ۱۱۷

۱۸۔ ایضاً ص ۱۱۷

۱۹۔ ایضاً ص ۲۱۸۔۲۱۷

۲۰۔ ایضاً ص ۱۴۹

۲۱۔ ایضاً ص ۱۵۳

۲۲۔ ایضاً ص ۱۶۶

۲۳۔ ایضاً ص ۱۵۳

۲۴۔ ایضاً ص ۱۷۱

۲۵۔ ایضاً ص ۱۷۱

۲۶۔ ایضاً ص ۶۵

۲۷۔ ایضاً ص ۶۵

۲۸۔ ایضاً ص ۱۲۷

۲۹۔ ایضاً ص ۱۲۷

۳۰۔ ایضاً ص ۱۷۱

۳۱۔ اور انسان مر گیا۔ دیباچہ، ''خواجہ احمد عباس''، مشمولہ، اور انسان مر گیا، راما نند ساگر، مکتبہ شعر و ادب، لاہور سن ندارد ص ۶

۳۲۔ داستان سے افسانے تک، ڈاکٹر وقار عظیم ص ۹۵، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء۔

۳۳۔ آزادی کے بعد اردو ناول از ڈاکٹر ممتاز احمد خان، ص ۳۹۰، انجمن ترقی اردو، طبع دوم، ۲۰۰۸ء۔